علامہ اقبال اور سر سید

پروفیسر منظر حسین

After the war of independence of 1857, the person who started his efforts to bring the Muslims out of decline is Sir Ahmad Khan. He saw the decline of the Mughal empire, he was also aware of the ideas and power of the British and he also had an idea of the problems that the Muslims would face in the future. Sir Syed started his reform efforts by trying to popularize education among Muslims. On the basis of his political insight, he believed that now the target of the British would be only the Muslims. In such a situation, the only way for Muslims to survive was education. Although Sir Syed was disagreed with, a personality like Akbar Allahabadi also acknowledged his services. Sir Syed Ahmad Khan not only made reform efforts but also produced people who played an important role in the national life of Muslims. Allama Iqbal is also included among the people who were influenced by him. Allama Iqbal's letters testify to the fact that he was not only influenced by Sir Syed's reform and educational activities, but also recognized the spiritual status of Sir Syed. Sir Syed also emphasized on learning modern sciences and women's education in order for Muslims to move forward side by side with the nations of the world in the national life.

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جس عبقری شخصیت نے اپنی ذہانت و قابلیت اور حکمت و فراست کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو جگانے، ان کو مایوسی اور لاچاری کے دلدل سے نکالنے، ان کے دلوں میں امید کی کرن روشن کرنے اور ان کو تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کی انتھک جدوجہد کی بلاشبہ وہ شخصیت سر سید احمد خاں کی ہے۔ سر سید احمد خاں ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اور ان کا سال وفات ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اکبر شاہ ثانی کا دور بھی دیکھا اور مغلیہ سلطنت کے

آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد زوال کے گواہ بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہندوستان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں نہ واپسی کا کوئی راستہ تھا اور نہ آگے بڑھنے کا حوصلہ۔ سرسید کے عہد میں جہاں مسلمانان ہند نے بہت کچھ کھو دیا وہیں انھیں نئے تقاضوں کو سیکھنے اور ان کے ساتھ چلنے کی ضرورت کا ادراک بھی ہوا۔ سرسید کے پیش نظر ہندوستان کے زخم خوردہ اور شکستہ مسلمان تھے۔ انھوں نے نے ذاتی طور پر غدر سے متاثر مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی تھی اور اس کے مضر اثرات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً خوف پیدا کر دیا تھا۔ انگریزی حکومت کا مسلمانوں کے تئیں جابرانہ رویہ باعث تردد بھی تھا اور باعث تشویش بھی۔ اس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف *Discovery of India* میں بھی کیا ہے۔ سرسید نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی صورت حال کو دیکھ کر جس طرح اپنے کرب کا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:

> غدر کے بعد نہ مجھ کو گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا کچھ رنج تھا۔ اپنی قوم کی بربادی کا ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اس خیال میں اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔ اور میرے بال سفید کر دیے۔[۱]

اسی قومی اور ملی ہمدردی و مروت نے سرسید کو آئندہ چالیس برس تک حالتِ اضطراب میں مبتلا رکھا لیکن اسی آشوب و ابتلا کے عہد میں انھوں نے کئی انقلاب آفریں کارنامے بھی انجام دیے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی معاشرے میں جو انقلاب آیا اس کے نتیجے میں سرسید کے ذہن پر ایک مجموعی اور کلی تہذیبی اثر مرتب ہوا لہٰذا انھوں نے عصری تقاضوں کے پیش نظر تبدیلی کے ہمہ گیر اور دوررس نتائج کا ادارک کیا اور ایک اثباتی ردعمل کے لیے ذہن کو تیار کیا۔ بقول علامہ اقبال:

> غالباً سرسید احمد خاں دور جدید کے وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی جھلک دیکھ لی تھی لیکن ان کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کی ہی تعمیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لیے سعی کی۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعے سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردعمل کیا۔[۲]

یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہی سرسید احمد خاں کی شخصیت اور کارناموں کی مکمل تصویر ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی افق پر جلوہ گر ہوئی۔ انھوں نے مصلحانہ کاوشیں بھی کیں جس کے لیے تعلیمی تحریک کا صور پھونکا۔ ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے نتائج، برطانوی سامراجیت کی یلغار اور مسلمانوں کی پستی کا بغور مشاہدہ کیا اور ان اسباب و عوامل کا جائزہ لیا جنھوں نے ہندوستان کی برطانوی

استعماریت کو تقویت دینے میں کلیدی کردار نبھایا ہے۔ سر سید کی شخصیت میں ہمیں ایک ایسے مصلح کی جھلک نظر آتی ہے جس نے اپنی ان تھک بے لوث سعی اور مستحسن تحریروں سے ایک شکست خوردہ قوم میں اعتماد اور یقین کی روح پھونکی بالآخر استعماری طاقتوں اور عیاریوں کو شکست ہوئی۔ انھوں نے ہندوستانی قوم میں از سر نو اعتماد بحال کرنے کی جس جدوجہد کا آغاز کیا وہ بخیر وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچا۔ سر سید کی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور زمانہ شناس نظروں نے اہل ہند کو علم و ہنر کی آگہی، تہذیبی شعور اور جدید انداز فکر دیا۔ ایک طرف جہاں ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کے پنجۂ ظلم و استبداد کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ ان کی اسلامی تہذیب اور ان کے علوم و اثرات حکومت کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ دوسری طرف اس وقت کے مسلمان نہ صرف انگریز حکمراں کی ناراضگی اور ہندوؤں کی عیاری کے شکار تھے بلکہ وہ اپنے گم گشتہ اسلاف اور شاندار ماضی سے بھی برسر پیکار تھے۔ انھیں ذہنی، معاشی اور معاشرتی دباؤ کا سامنا تھا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ مذہبی علماء اپنے اپنے نظریات کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ مسلمان اکابرین اپنی کھوئی ہوئی میراث پر نوحہ خواں تھے اور مسلم نوجوان اپنی ناقدری اور ناانصافی پر شاکی و نالاں۔ ایسے میں سر سید ایک معلم، مصلح، مفکر اور نجات دہندہ رہنما کے روپ میں ابھرے۔ انھوں نے اپنی مدبرانہ اور مصلحانہ صلاحیتوں سے انسانی دل و دماغ خصوصی طور پر مسلمانوں کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سامراجی طاقتوں کا جواب بہترین حکمت عملی سے دیا۔ ایک پژمردہ اور مایوس قوم میں امید اور اعتماد کی روح پھونکی۔ ان کی تعلیمی اور سیاسی بصیرت اور شعور نے مسلمانوں کو وقت سے مقابلہ کرنے کی قوت بخشی۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنا، انھیں بے عملی اور مایوسی سے نجات دلانا اور بحیثیت مقام اور ترقی حاصل کرنا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنی مصلحانہ اور مدبرانہ کاوشوں سے مذہب، تہذیب، ثقافت، زبان و ادب، تعلیمات اور معاشرت سبھوں کو متاثر کیا۔ اس کا اعتراف مخالفین بھی کرتے ہیں اور مداحین بھی۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

> فتح مندی کے سنگ میل بھی ہیں اور پس پائی کے نشانات بھی۔ مصالحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں اور ناروا سمجھوتے بھی اور سر سید کی ہمہ گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ ان کی تحریک کے سرے نشیب و فراز کے افکار و اعمال میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے سر سید کے آئینے میں ان کے خدوخال کو دیکھنا مفید ہوگا۔''[۳]

سر سید کے افکار و نظریات سے اختلاف کرنے والوں میں ایک اہم نام اکبرالٰہ آبادی کا ہے لیکن سر سید کے انتقال پر اکبرالٰہ آبادی نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا

ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں اے اکبرؔ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید کی عبقری شخصیت اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔ ایک تحریک تھی، جنھوں نے اپنے فکر و نظر اور مجددانہ عمل سے زمانے کے رخ کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے عروق مردہ میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے۔ جہد و عمل میں حرکت وحرارت اور یقین و اعتماد کی قوت عطا کی۔ شبلی نعمانی جنہیں سرسید کے افکار ونظریات سے جزوی اختلاف رہا اس کے باوجود اخیر عمر میں ایک دوسرے کے لیے جو جذبہ محبت رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شبلی ایک عرصے تک سرسید کے ہمدم اور ہمراز بھی رہے۔ ۱۸۸۹ء میں شبلی نے جب المامون لکھی تو سرسید نے اس پر دیباچہ بھی لکھا۔ شبلی نے بھی سرسید کی علمی ادبی، قومی وملی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہے۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعضوں نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا ہے ہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں۔[۴]

شبلی نے سرسید کے فیضان کا اعتراف کیا ہے جس کی تائید مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیات شبلی'' پر حاشیہ لگاتے ہوئے تبصرہ لکھا ہے۔ سید سلیمان ندوی سے ایک جگہ اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسید کی وجہ سے ہوئی ہے۔

مولانا آزاد نے تو یہاں تک اعتراف کیا ہے کہ سرسید کے اثرات نے ان کی زندگی کا رخ متعین کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی گذر چکا ہے جب سرسید مرحوم کی تصنیفات نے میرے دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا اور یہ میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ بلا شبہ یہ اثر آگے چل کر دھیما پڑ گیا اور مجھے فکر و نظر کی دوسری منزلیں پیش آئیں۔ تاہم میرا دماغ ان کے مصلحانہ اعمال کے تاثر سے کبھی خالی نہ رہا۔[۵]

اس مقالے کا موضوع چونکہ ''اقبال اور سرسید'' ہے لہٰذا عنوان کے پیش نظر دونوں عبقری شخصیتوں

کے مابین افتراق و مشابہت کی تلاش مقصود ہے ۔ اقبال کی پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ میں ہوئی ۔ یہ دور سرسید احمد خاں کی تحریک کا عروجی نقطہ ہے ۔ تحریک سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایسا جرأت مندانہ قدم تھا جس نے ان کے لیے سوچ اور فکر کے نئے در وا کیے ۔ انھوں نے اپنی تعلیمی ، سماجی ، مذہبی ، تہذیبی اور اصلاحی مشن سے اس دور کے تمام باشعور افراد کو دعوت دے کر ان میں جوش و حوصلہ پیدا کیا اور اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کیا ۔ اقبال کے شفیق استاد مولانا سید میر حسن سرسید احمد خاں کے پر جوش حامیوں اور عقیدت مندوں میں تھے ۔ اپنے شفیق استاد کے توسط سے اپنے ابتدائی دور میں اقبال یقینی طور پر متعارف بھی ہوئے ہوں گے اور متاثر بھی ۔ آگے چل کر سرسید کی تحریک اور اس کے مقاصد سے بھی آشنائی ہوئی ۔ پروفیسر عبد الحق نے اپنی کتاب اقبال کے ابتدائی افکار میں سرسید اور سید میر حسن کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرسید جب کبھی لاہور جاتے تھے تو ان کا قیام اقبال کے استاد سید میر حسن کے یہاں ہوتا تھا ۔ لہٰذا اقبال کا سلسلہ بالواسطہ طور پر سرسید سے مل جاتا ہے اور سید میر حسن کے ذریعہ سرسید کا اثر اقبال پر پڑا دونوں کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے دونوں کے مقاصد ، نصب العین اور اصول و نظریے میں بڑی حد تک مشابہت ، یکسانیت و مماثلت ہے ۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب میں انگریزوں کی عوام مخالف پالیسیوں کو اپنی تصنیف اسباب بغاوت ہند میں جس طرح بے نقاب کیا ہے ان کی جرأت و ہمت حکمت اور دور اندیشی کا بین ثبوت ہے ۔ سرسید نے حکومت کے ملازم ہونے کے باوجود ۱۸۵۷ء میں ''اسباب بغاوت ہند'' قلم بند کیا ۔ یہ تصنیف سرسید کی سیاسی سوجھ بوجھ اور جرأت و ثابت قدمی کی ایک لاجواب مثال ہے ۔ مسلمانوں کے خلاف انگریزی حکومت کے دل میں جو نفرت اور غبار بھرا ہوا تھا ، سرسید کی مذکورہ کتاب نے اس میں خاطر خواہ کمی کی ۔ اقبال نے سرسید کی زندگی اور اصلاحی کارناموں سے جو اثر قبول کیا ہے ان کی جرأت و مومنانہ فراست کو خراج عقیدت اپنی نظم 'سید کی لوح تربت' میں سرسید موصوف کی لوحِ تربت کی زبان میں ادا کیا ہے ۔ دیکھئے یہ بند:

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

سر سید اور ان کی تحریک سے علامہ اقبال کی وابستگی اور واقفیت گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے استاد ٹی ۔ ڈبلیو، آرنلڈ کے ذریعہ بھی ہوئی ہوگی ۔ ان کے ذریعہ بھی اقبال نے علی گڑھ تحریک سے اثر قبول کیا ۔ اقبال سر سید سے کس حد تک متاثر تھے اور انھیں کس درجہ قلبی لگاؤ تھا اس کا اندازہ اقبال کے اُس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۳؍ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کے نام لکھا ہے:

۳؍ اپریل کی شب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سر سید علیہ الرحمہ کو خواب میں دیکھا ۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو ۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گذر گئی ۔ فرمایا حضرت رسالت مآب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو ۔ میری آنکھ کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر جواب طویل ہو گئے میری زبان پر جاری ہوگئے ۔ انشاء اللہ ایک مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' نام کے ساتھ عرضداشت شائع ہوگی ۔[۶]

اس خواب کا حال انھوں نے ۲۹؍ جون ۱۹۳۶ء کو سر راس مسعود کے نام خط لکھ کر بیان کیا ۔ دیکھئے یہ تراشہ:

۳؍ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمھارے دادا رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا ۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کر میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ اشعار عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے ۔[۷]

اس خواب کو مابعد الطبعیاتی بشارت سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے اور نفسیاتی حوالے سے شعور اور لاشعور کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

بقول عبدالحلیم شررؔ:

ابتدائی زمانے میں وہ ایک پیرو حدیث مسلمان تھے اور اس مذہبی ریفارم سے متاثر تھے جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ سے شروع ہوکر مولوی شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زبردست ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچی تھی ۔ اس ریفارمیشن نے دو باتیں انھیں پہلے ہی سے بتا رکھی تھیں ۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مذہبی رسوم کثرت سے مروج ہیں ان کا اصل مذہب اور حقیقی تعلیم نبوت میں پتہ نہیں اور دوسرے یہ کہ جو روایتیں اور حدیثیں اور سنن و آثار اسلام کے عام علماء و واعظین کی زبانوں سے سنے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ضعیف و موضوع ہیں ۔[۸]

سر سید آخری زمانے تک اہل حدیث مسلک پر قائم رہے اور غیر مقلد تھے ان کا فقہ حنفی میں اعتقاد ختم ہو گیا تھا۔ وہ حیلۂ شرعی کو مذہب کی روح کے لیے منافی تصور کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں ایک جامع صفات اور مختلف الجہات شخصیت کے حامل تھے وہ ایک بلند پایہ عالم، مفسر، محقق، مورخ کے علاوہ معتبر مصلح اور مجدد تھے ۔ ایک مصلح یا مجدد کبھی مقلد نہیں ہوتا بلکہ وہ مجتہد اور فکری اعتبار سے آزاد ہوتا ہے ۔ وقت کی

ضرورت اور حالات کے مطابق وہ مختلف دینی، اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اپنی منفرد رائے رکھتا ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید ایک مخلص مصلح تھے۔ اصلاح وتجدید کا پہلو ان کی دیگر تمام خصوصیات پر غالب تھا۔ ان کا اصلاحی شعور محکم اصولوں پر قائم تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور اصلاح معاشرت کی کوششوں کے ذریعہ سے تجدید اور اجتہاد کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی تاکہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے ارتقا کی نئی نئی راہیں کشادہ ہوں۔ جب انھوں نے علم الکلام اور تفسیر پر لکھنا شروع کیا اور عصری تقاضوں کے تحت یہ ثابت کیا کہ قرآنی قوانین قانونِ قدرت کے مطابق ہیں اور مافوق الفطرت واقعات کی سائنٹفک طور پر توجیہہ پیش کی تو سرسید کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا تنگ نظر اور جمود پسند علمائے کرام کی جانب سے ہوا۔ قدامت علماء نے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ وہ نیچری ہیں اور اسلام سے منحرف ہو گئے ہیں۔ ایسے تنگ نظر علماء کی پست ذہنیت کی عکاسی امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ہمارے تنگ خیال علماء کرام نے اسلام کو جو نقصانات پہنچائے ہیں وہ ملحدوں کے نقصانات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ بد نیتی سے نہیں بلکہ اپنی جہالت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تنگ نظر قدامت پسندوں نے اسلام کے دشمنوں کا راستہ صاف کر دیا اور انھیں یہ موقع دیا کہ وہ اسلام پر یہ الزام لگائیں کہ اسلامی تعلیم جدید ترقی کے منافی ہے اور اس تنگ خیال جماعت نے مسلمانوں کو دنیا سے کاٹ کر اسلام کو محض آخرت کا دین بنا دیا۔ انھیں قدامت پسندوں نے سائنس، کیمیا اور فلسفۂ جدید کے خلاف اس لیے لڑائیاں لڑیں کہ یہ کافروں کے علوم ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے ان علوم کے دروازے بند کر دیے اور یہ علوم جدیدہ سے الگ رہنے کا نتیجہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو دیگر اقوام کا شکار بنا دیا۔ ہم برابر پیچھے ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ترقی کر رہے ہیں۔[9]

اقبال نے بھی ایسے علماء پر سخت تنقید کی ہے۔ سرسید احمد کی طرح علامہ اقبال نے اختلاف فکر کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ عقلی اور سائنسی تھا۔ اقبال نے بھی فلسفیانہ تصورات کو عقیدے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سائنسی نظریے اور رویے سے مدد لی۔ وہ بھی سرسید کی طرح اس نظریے کے حامی تھے مذہب اور سائنس کے مابین کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اقبال نے ہمیشہ اپنے پیغام میں کتاب وحکمت دونوں پر زور دیا ہے:

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است
این دو قوت اعتبار ملت است

اپنی تصنیف تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں اقبال نے مذہبی علم کی سائنسی صورت

دعویٰ کو پورا کرنے کے لیے اپنے خطبات کو ترتیب دیا۔ ان کو یقین تھا کہ سائنس سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ سائنس بھی حقیقت کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے جو مذہبی تجربے کی مدد کر سکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی تشکیل نو کا جو سلسلہ سرسید احمد خاں نے شروع کیا تھا علامہ اقبال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون ''اسلام اور احمدیت'' میں سرسید کی حقیقی عظمت کا اعتراف کیا ہے کہ سرسید پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کی جدید تعین سمت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ وہ اس موضوع پر کام بھی کیا ہے۔ ان کی حقیقی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے وہ اس بات کے معترف ہیں کہ سرسید احمد کی بے چین روح نے ہی عہد جدید کے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے مسلمان قوم کو جدید حالات کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے تیار کیا۔ انھوں نے ایک خط میں سرسید کے مذہبی تصانیف کے متعلق لکھا ہے:

جس قسم کا علم الکلام اور دین از منۂ وسطیٰ کے مسلمان کی تسکین قلب کے لیے کافی ہوا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔ اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی از سرِنو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے اور بہت سے مسائل کی طرح اس کم و بیش گویا نہ تھی جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ انھوں نے اس کی بنیاد زیادہ تر ایک گذرے ہوئے عہد کے فلسفیانہ معتقدات و افکار پر رکھی۔[۱۰]

بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

سرسید دنیا میں وہ پہلا شخص ہے، جس نے پہلے پہل یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علوم کلام کی ضرورت ہے۔

جب علمائے سہارنپور نے اپنے فتویٰ میں سرسید کو کافر قرار دیا تو اس فتویٰ پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ نے سرسید کا دفاع ان الفاظ میں کیا ہے:

یہاں بحث سرسید کے معتقدات سے نہیں۔ بحث اس امر سے ہے کہ اسلام اور کفر کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟ اسلام جو کچھ بھی ہے، اس میں نہ الجھاؤ ہے نہ ایچ پیچ کہ ہم اسلام اور کفر میں فرق نہ کر سکیں یا اس بات میں کسی خاص مخصوص تنظیم کا رخ کریں۔ علمائے سہارنپور نے یہ نہیں سوچا کہ سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، تہذیب الاخلاق نکالا۔ علی گڑھ کالج قائم کیا یا مسائل الٰہیات پر قلم اٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا۔ یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو۔ وہ ایک قوم ہیں۔ لہٰذا بحیثیت ایک قوم انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے سیاسی معاشی اور علوم و فنون میں ان کے اجتہادات اور اختراعات ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد رکھیں کہ مذہبی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کی جو رَو انگریزی تسلط کے ساتھ آ گئی ہے۔ ڈرنے کی چیز نہیں۔ ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔[۱۱]

سرسید اور علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا ایک اہم پہلو تقلید سے انحراف ہے۔ دونوں مفکرین اندھی

تقلید اور روایت پرستی کے بجائے معروضیت اور عقلیت کی ترغیب دیتے تھے۔ دونوں کے نزدیک اصلاح معاشرت کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور احادیث صحیحہ سے حاصل ہوئی ہیں، نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ ایسی خیر خواہی نے مجھ پر انگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔[۱۲]

اقبال بھی سرسید کی طرح قوم کی زندگی اور تازگی کے لیے اجتہاد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ اس خیال کے مؤید تھے کہ قوم میں ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے جو دل کی گہرائیوں اور دماغ کی صلاحیتوں سے قوم کو نئے نئے تصورات سے روشناس کرائیں۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کا نیا طریقہ بتائیں یہ کام کسی زوال پذیر قوم کی تجدید واحیاء کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قومی زندگی کے لیے تقلید کی حیثیت بادِسموم کی ہے جو ہر طرح سے مضر ہے۔ وہ مسلمانوں کی صدیوں کی ذہنی پستی کی وجہ اندھی تقلید کو ہی قرار دیتے ہیں جس کا تدارک اجتہاد وتجدید کو گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک تقلید عوام کے لیے تو بیشک جائز ہے لیکن قوم کی ذی علم اور عبقری شخصیتوں کے لیے کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ اپنی کتاب *The Reconstration of Religious Thought in Islam* میں لکھتے ہیں:

The task before the modern Muslim is, therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past. Perhaps the first Muslim who felt the urge of a new spirit in him was Shah Wali Allah of Delhi.[13]

آج کے مسلمانوں کے سامنے ایک بہت بڑا کام درپیش ہے۔ اسے ماضی سے بالکل منقطع ہوئے بغیر اسلامی نظریات کے متعلق از سرِنو غور وفکر کرنا ہے۔ شاید سب سے پہلے مسلمان جنھوں نے اپنے اندر ایک نئی بیداری کا احساس کیا وہ شاید ولی اللہ دہلوی تھے۔

ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اقبال نے بیسویں صدی میں مسلم زعماء وارباب علم وفکر کو اجتہاد کی ضرورت، اہمیت اور معنویت کی طرف متوجہ کرنے کی سعیٔ مستحسن کی۔ اور جرأت فکر کا ثبوت دیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سرسید کی طرح اسلامی عقائد کی تشریح وتعبیر میں اقبال سے بھی فکری لغزشیں ہوئی ہیں۔ ان دونوں عبقری شخصیتوں نے مسلمانوں کے فکری جمود کو توڑنے اور عالمانِ کم نظری کی تقلیدی روش کے خلاف جو کاوشیں کی ان کا مقصد زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے ارتقا کی نئی نئی راہیں کشادہ ہوں۔ کسی خوف طعن وتشنیع کے بغیر بالکل سرسید کی طرح یہ اعلان کرتے ہیں:

The only course open to us is to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that

knowledge, even though we may be led to differ from those who have gone before us.[14]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

For fear of further disintegration, which is only natural in such a period of political decay[15]

مجھے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اقبال کی فکر پر سرسید کے افکار وعقائد کا کسی حد تک اثر تھا۔ وہ بھی سرسید کی طرح ملّتِ اسلامیہ کے جمود وانحطاط کی بڑی وجہ اجتہاد کے فقدان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور اس کے اندر ارتقائے حیات کے ہر مرحلے پر مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ اقبال تقلید کو حرکت وعمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ مصرع:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی[۱۶]

اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کے احیا کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ تقلید سے حرکت وعمل سلب ہوجاتی ہے اور ذہنی وفکری قوت معدوم۔ وہ کہتے ہیں:

زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور
جانشین از تقلید گردد بے حضور
ای بہ تقلیدش اسیر ، آزاد شو
دامن قرآں بگیر آزاد شو[۱۷]

زندہ دل خود زمانے کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کی روح تقلید کے تصور سے بے اطمینانی محسوس کرتی ہے۔ اسے آنکھ بند کر کے زمانے کی تقلید کرنے والے، تم قرآن کے دامن کو پکڑ لو اور اس قید سے آزاد ہو جاؤ۔

جہاں تک سرسید اور علامہ اقبال کے تصور تعلیم کا معاملہ ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کبھی بھی مشرقی تعلیم کے دشمن نہیں رہے اور نہ ہی اس کے حامی رہے کہ نوجوانوں کی تعلیم غیر ملکی حکومت کے قبضے میں دے دی جائے لیکن اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ کسی اچھی چیز کو حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ملاحظہ ہو سرسید احمد کی تقریر کا وہ اقتباس جو انھوں نے ۹؍جنوری ۱۸۸۴ء کو امرتسر میں کیا تھا:

مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت اور بلاغت میں لاثانی ہے مگر افراط وتفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمرے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاشی، ہماری بہتری، ہماری زندگی بآرام سر ہونے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل نگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیے۔[۱۸]

سرسید احمد کے ان خیالات کی عکاسی ان مضامین مین بھی ملتی ہے جو ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوئے جن کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کی تعلیم کے لیے کوشاں تھے۔ دیکھئے سرسید کے مضمون کا ایک اقتباس جو ''مذہب اور عام تعلیم'' کے عنوان سے تہذیب الاخلاق کے ۱۵ر شوال ۱۲۸۷ھ کے شمارے میں شائع ہوا:

> ہر ضلع میں کم از کم ایک مدرسہ قائم کرنا چاہیے جس سے ہر قسم کے مطالب و مقاصد پورے ہوں کیوں کہ تمام لوگوں کے ایک ہی سے مقاصد نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص مولوی، محدث وفقیہہ بننا چاہے تو مولوی بننے کا بھی موقع اس میں موجود ہو۔ اگر کوئی شخص بڑا ریاضی داں بننا چاہے تو وہ بھی اس میں اپنا مقصد حاصل کر سکے اور اگر کوئی شخص علوم زبان انگریزی میں تحصیل کامل کرنا چاہے اور عہدۂ جلیلہ گورنمنٹ کو حاصل کرنا چاہے وہ بھی کر سکے۔ جب ایسا انتظام اور سلسلہ قائم ہوجائے گا تب مسلمانوں کی تربیت اور دینی و دنیوی ترقی کی توقع ہوتی ہے۔[۱۹]

تعلیم نسواں کے سلسلے میں بھی سرسید احمد خاں بہت سنجیدہ تھے۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۶۹ء کے گزٹ میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں ایک بھرپور اداریہ قلمبند کیا جس کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس سلسلے میں بے جا مداخلت کے مخالف بھی تھے۔ میں یہاں صرف ایک تراشے پر اکتفا کرتا ہوں:

> گورنمنٹ نے صرف اس بات پر اکتفا کیا ہے کہ صرف عورتوں کی تعلیم کے فائدے اور خوبیاں بیان کرنے سے ہندوستانیوں کو اس بات کی ترغیب دی جائے اور بطیّب خاطر ان کو برانگیختہ کیا جائے تاکہ وہ اس قدیمی عادت کو چھوڑ کر عورتوں کی تعلیم و تربیت کی جانب متوجہ ہوں اور خود ہی اس کام کو بشوق و ذوق شروع کریں تاکہ ان کو اس بات کا موقع ملے کہ وہ اپنی قدیمی رسوم و عادات کی پابندی کے ساتھ اس عمدہ تدبیر سے فائدہ اٹھائیں اور یہ کامیابی تمام اپنے مقصود کو پہنچیں۔ پس ہم اپنے ہم وطن ہندوستانیوں کو اس جانب مائل کرتے ہی کہ وہ اپنی بے جا عادات کے اس درجہ پابند نہ ہوں جس کے سبب سے ان کو کبھی ترقی نصیب نہ ہو اور جیسا کہ اب تک ہے ان کا ملک ہمیشہ بے رونق ہوگا۔[۲۰]

❁...❁...❁

حوالہ جات وحواشی

۱- بحوالہ: حرف اقبال، مرتبہ لطیف احمد خاں شیروانی، لاہور، ۱۹۵۵ء ص ۱۴۸

۲- خطباتِ سرسید جلد اول ص ۲۷۸، (بحوالہ) تہذیب الاخلاق جلد ۳۵ شمارہ ۱۱۰، اکتوبر ۲۰۱۶ء ص ۳۳۱

۳- مشمولہ سرسید احمد خاں - ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۰، عتیق احمد صدیقی
۴- مقالات شبلی
۵- بحوالہ: اقبال اور سرسید، مشمولہ: تہذیب الاخلاق
۶- خط بنام پروفیسر الیاس برنی، بابت ۱۳ جون ۱۹۳۶ء بحوالہ: کلیات مکاتیب اقبال، جلد چہارم
۷- خط سر راس مسعود، بابت ۲۹ جون ۱۹۳۶ء بحوالہ: کلیات مکاتیب اقبال، جلد چہارم
۸- بحوالہ: سرسید احمد خاں کی دینی برکتیں، عبدالحلیم شرر مشمولہ تہذیب الاخلاق اکتوبر ۲۰۱۲، ص ۳۹
۹- بحوالہ سرسید احمد خاں اور جدت پسندی ڈاکٹر محمد علی صدیقی ص ۱۱۵ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی
۱۰- بحوالہ: اقبال نامہ حصہ دوم، شیخ عطاء اللہ ص ۱۰۳
۱۱- بحوالہ اقبال کے حضور، جلد اول سید نذیر نیازی ص ۲۸۵
۱۲- بحوالہ خطوط سرسید مرتب سید راس مسعود، نظامی پریس ۱۹۳۱ء، ص ۵۳

13- Allama Iqbal, *The Reconstruction of the Religious Thought in Islam*, p.97.

14- Ibid

15- Ibid, p.171-172

۱۶- علامہ اقبال، کلیات اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۳
۱۷- علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۶۶۰
۱۸- تقریر بمقام امرتسر بتاریخ ۲۹ جنوری ۱۹۸۴ء، لیکچر کا مجموعہ ص ۱۸۴
۱۹- بحوالہ: تہذیب الاخلاق ۱۵ شوال ۱۲۸۷ھ
۲۰- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ ۱۲ نومبر ۱۸۶۹ء